تدبرِ قرآن

۱۰۲

التکاثر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ القارعۃ ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں بتایا ہے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز وہ نیکیاں ہیں جو اس دنیا میں کر لی جائیں۔ خدا کی میزان میں انہی کے اندر وزن ہو گا۔ جس نے ان کا ذخیرہ جمع کر لیا وہ فلاح پائے گا اور جو ان سے محروم رہا اس نے، خواہ کتنا ہی خزانہ اکٹھا کر لیا ہو، اس کی میزان بالکل بے وزن رہے گی۔ حسرت واندوہ کے سوا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔

اب اس سورہ میں ان لوگوں کو متنبہ فرمایا ہے جنھوں نے ساری عمر اس جدوجہد میں کھپا دی کہ مال و دولت کے اعتبار سے وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں، ان کا بنک بیلنس سب سے زیادہ ہو جائے، کاروباری میدان میں کوئی ان کا حریف نہ رہے۔ معیارِ زندگی کی مسابقت میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ بس اسی تگ و دو میں ان کی ساری زندگی ختم ہو گئی اور اس امر پر غور کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے ایک یقینی مرحلہ حساب کتاب اور جزاء و سزا کا بھی آنے والا ہے جس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والوں کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا اور اس دن ہر ایک سے یہ پرسش بھی ہونی ہے کہ اس نے دنیا میں جو کچھ حاصل کیا کس راہ سے حاصل کیا اور اس کو کس راہ میں صرف کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں اور صلاحیتیں اور جو نعمتیں اس کو بخشیں ان کا کتنا حصہ اس نے بخشنے والے کی خوشنودی کے لیے استعمال کیا اور کتنا اپنے نفس اور شیطان کی خوشنودی کے لیے۔

سُورَةُ التَّكَاثُرِ

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

آیات ۱-۸

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ﴿٥﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴿٦﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٧﴾ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ﴿٨﴾

ع ۸ / ۲۷

ترجمہ آیات ۱-۸

تم کو طلب مال کی مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم آگے جا نو گے! ہاں، ہرگز نہیں، تم آگے جان لو گے! ۱-۴ ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ دوزخ سے ضرور دو چار ہو گے، پھر تم اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے اس دن نعمتوں کے باب میں پرسش ہونی ہے تو......... ۵-۸

———

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ (۱)

'اِلْهَاءٌ' کے معنی غافل اور مبتلائے فریب رکھنے کے ہیں۔

'تَکَاثُر' کے معنی ہیں مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تگ و دو۔

معیارِ زندگی اونچا کرنے کا خبط

عرب جاہلیت میں حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری چونکہ خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی خاندان کو حاصل ہوتا جس کے افراد زیادہ ہوں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر ان کے ہاں مال کے تکاثر کے ساتھ ساتھ اولاد کے تکاثر کے جذبہ کو بھی بہت قوی کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے لٹریچر پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے مال کی کثرت پر فخر کرتے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے۔ اب موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصورات نے اولاد کی کثرت کے رجحان کو دبا کر اس کی جگہ معیارِ زندگی کے رجحان کو غالب کر دیا ہے۔ اس دور کی عام بیماری یہی ہے۔ مشکل ہی سے اس زمانے میں کوئی شخص اس وبا کے اثر سے محفوظ ملے گا۔ ہر شخص رات دن معیارِ زندگی اونچا کرنے کی دھن میں ہے اور چونکہ اس کی کوئی حد معین نہیں ہے اس وجہ سے جو اس میدان میں گامزن ہیں ان کو اپنا ہر قدم پہلا قدم معلوم ہوتا ہے، آخری منزل نگاہوں سے اوجھل ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، کب آئے گی اور کبھی آئے گی بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی کا سارا انحصار مال پر ہے تو جب معیار کی کوئی حد معین نہیں ہے تو مال کی حرص میں بھی کسی کمی کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کی ترنس بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا اثر یہ بتایا ہے کہ اس نے ہر شخص کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں گرفتار کر لیا ہے کہ اسی میں عمر بیت جاتی ہے اور کسی کو اس سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہے تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے یا نہیں۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲)

یعنی اسی تگ و دو میں زندگی گزرتی ہے یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے اور قبروں میں جا پہنچتے ہو۔ لفظ 'زُرْتُمْ' عربی میں بالکل سادہ معنوں میں آتا ہے۔ اردو کے لفظ 'زیارت' کی طرح اس کے اندر

کسی شرف و تقدس کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ "زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" کے معنی بس یہ ہوں گے کہ تم نے قبروں کو دیکھا یعنی ان کے حوالے ہوئے۔ کسی حماسی کا شعر ہے:

اذا زرت ارضا بعد طول اجتنابها — فقدت صدیقی والبلاد کما ھیا

(جب میں کسی سرزمین کو، عرصہ تک اس سے جدا رہنے کے بعد، دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ احباب تو میں نے سارے کھو دیے لیکن زمین اسی طرح ہے جس طرح تھی)

سرگشتگانِ دنیا کی حالت پر اظہار افسوس

اگرچہ عربوں میں یہ روایت بھی رہی ہے کہ اپنے قبیلہ کے ناموروں اور مقتولوں کی قبروں کا شمار رکھتے اور مفاخرت کی مجلسوں میں ان کا ذکر بھی کرتے لیکن یہ چیز یہاں مراد نہیں ہے اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے کہ اس کا یوں ذکر آئے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب "حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" کا کیوں اختیار کیا گیا، سیدھے لفظوں میں یوں کیوں نہیں کہا گیا کہ "یہاں تک کہ تمھاری موت آگئی"، یا یہاں تک کہ تم نے جان، جان آفریں کے حوالہ کی۔ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو قافیہ کی رعایت یہ اسلوب اختیار کرنے کی مقتضی ہوئی دوسرے اس سے سرگشتگانِ دنیا کی محرومی و بے نصیبی پر اظہار افسوس کا مضمون آیت میں پیدا ہو گیا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اسی تکاثر کی بھاگ دوڑ میں لگے رہے یہاں تک کہ قبروں سے دوچار ہوئے یا قبرستانوں میں جا پڑے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳-۴)

یہ ان غفلت کے ماتوں کو تنبیہ اور نہایت زوردار و مؤثر تنبیہ ہے کہ سب کچھ سمجھا دینے کے بعد بھی اگر تم آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو تو سن رکھو کہ زندگی یہی نہیں ہے جو تمھیں نظر آ رہی ہے اور جس کے عشق نے تمھیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ اس کا اصل چہرہ تمھاری نظروں سے اوجھل ہے جس کو تم جلد دیکھو گے اور پھر سن لو کہ اس کو تم عنقریب دیکھو گے!!

یہ تاکید در تاکید انذار کو مؤثر بنانے کے لیے بھی ہے اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے بھی کہ جس قوم کو اللہ کا رسول انذار کرتا ہے وہ اس کی تکذیب کے نتیجہ میں اس دنیا میں بھی گرفتارِ عذاب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اس کے آگے وہ سب کچھ آئے گا جس سے رسول نے آگاہ کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو اس دنیا میں بھی دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمھارے لیے عدالت قائم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لفظ "تَعْلَمُوْنَ" کے ابہام کے اندر جو وعید مضمر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۭ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۵-۸)

غفلت کا اصل سبب

یہ ان غافلوں کی اس غفلت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ تمھاری یہ حالت اس وجہ

سے ہے کہ تم کو یہ یقین نہیں آرہا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن جہنم کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے ان تمام نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے جو تمھارے رب نے تم کو بخشیں لیکن تم نے ان کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا۔ اگر ان باتوں کا یقین ہوتا تو تم اپنی زندگیاں اس طرح دنیا کے پیچھے نہ گزارتے بلکہ لمحہ لمحہ اس آنے والے دن کی تیاریوں میں صرف کرتے۔

کلام کی تالیف

کلام کی تالیف پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے۔ جواب کو محذوف تو سب مانتے ہیں لیکن 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' اور بعد کی آیات کو 'لَوْ' کے تحت نہیں مانتے لیکن میرے نزدیک یہ تینوں آیتیں 'لَوْ' کے تحت ہی ہیں۔ یعنی اگر تم یہ یہ باتیں یقین کے ساتھ جانتے ہوتے تو اپنے آپ کو اس طرح نہ کھو بیٹھتے۔

'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' سے کلام کا پھر آغاز نہیں ہو رہا ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے خیال کیا ہے، بلکہ یہ 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے مفعول کے محل میں ہے یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ تم جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ 'لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ' پر 'ل' اس یقین کی تعبیر کے لیے ہے جس کا ہونا مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم یقین جو ان باتوں کو ماننے کے لیے مطلوب ہے اس کے وسائل اللہ تعالیٰ نے آفاق و انفس کے شواہد اور قرآن کی آیات بیّنات میں رکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہر عاقل مکلف ہے کہ ان کو سمجھے اور مانے۔ جو ان سے گریز کرتا ہے، خواہ سمجھنے سے گریز کرتا ہے یا اس کے قبول کرنے سے وہ اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے۔ عند اللہ وہ اپنے اس گریز کی سزا بھگتے گا۔

اس دنیا میں صرف علم یقین حاصل ہوتا ہے

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ ایک عاقل کو اس دنیا میں غیب کے حقائق کا علم یقین تو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ علم یقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس اور قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن عین الیقین کا درجہ اس کو آخرت ہی میں حاصل ہوگا اس لیے کہ اس کا تعلق معائنہ و مشاہدہ سے ہے۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے ان کا دعویٰ ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے۔ اس دنیا میں عین الیقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس بات کا علم یقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے وہ ایک دن ہم آنکھوں سے بھی دیکھیں گے۔ عین الیقین اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے۔

نعمتوں کا حق

'ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ'۔ یہ بات بھی 'لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ' کے تحت ہی ہے یعنی اگر تمھیں اس بات کا علم ہوتا کہ اس دن تم سے تمام نعمتوں کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش سے مراد، ظاہر ہے کہ، وہ سزا ہے جو ان کی ناشکری، ناقدری اور ان کے سوء استعمال کے نتیجہ میں بھگتنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں و صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جو وسائل و ذرائع بھی بخشے

ہیں وہ سب 'نعیم' میں داخل ہیں۔ ان کا فطری حق یہ ہے کہ ان کے لیے خدا کا شکرگزار رہا جائے اور ان کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر ان کاموں میں استعمال کیا جائے جن کے لیے وہ عطا ہوئے ہیں۔ کوئی نعمت اگر ضائع کی گئی یا وہ خالق کی پسند کے خلاف استعمال ہوئی تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے۔ انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضاء و جوارح نعمت ہیں، اسی طرح اس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بھی نعمت ہیں، علیٰ ہذا القیاس اس دنیا میں زندگی کے جو اسباب و وسائل اس کو عطا ہوئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت ہیں۔ ان کا فطری حق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ انسان ان کو برتے اور اپنے رب کا شکرگزار رہے۔ اس ناشکرگزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کے برتنے میں نہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ ان میں سے کسی کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو جائے کہ اسی کو معبود بنا بیٹھے اور خدا کو بھول جائے۔ جو لوگ اس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا ہوں گے وہ قیامت کے دن لازماً اس کی سزا بھگتیں گے۔

اس سورہ میں چونکہ تکاثر اموال کے فتنہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے اس وجہ سے وہ یہاں خاص طور پر پیش نظر ہے۔ ہر صاحب مال سے یہ سوال ہوگا کہ اس نے اپنا مال کن راستوں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں صرف کیا۔ جنھوں نے نہ اس کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی پروا کی اور نہ اس کے صرف کرنے میں اصل مالک کی مرضی پیش نظر رکھی بلکہ مال ہی کو انھوں نے معبود بنا لیا اور اسی کے حاصل کرنے میں ساری زندگی کھپا دی ان کو اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا جو سورۂ ہمزہ میں بیان ہوا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۠	ہلاکی ہے ہر اس اشارہ باز، عیب جو کے لیے جس نے مال سمیٹا اور اس کو گن گن کر رکھا۔ یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس کے مال نے اس کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہرگز نہیں وہ چور چور کر دینے والی میں پھینکا جائے گا۔ اور کیا سمجھے کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے! خدا کی بھڑکتی آگ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔ وہ اس میں بند ہوں گے لمبے ستونوں میں جکڑے۔
(الھمزۃ - ۱۰۴: ۱-۹)	

آخر میں 'لو' کا جواب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محذوف ہے۔ شرط کا جواب ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اظہار کے بغیر واضح ہو۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس

حذف سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات محذوف مانی جا سکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ مخاطب کو گویا یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ خود ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں (اور ان کے صحیح ہونے سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے) تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور اس نے اب تک جو زندگی گزاری ہے وہ کتنی غلط، حقائق سے کتنی بعید اور انجام کے اعتبار سے کتنی ناعاقبت اندیشانہ اور لاابالیانہ زندگی گزاری ہے۔ یہاں اس حذف سے یہ سارا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم ان بدیہی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرتے تو اپنی قیمتی زندگی یوں برباد نہ کرتے۔ اب بھی اگر بھلائی چاہتے ہو تو عقل سے کام لو اور جس زندگی کے بدلے ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہو اس کو اس دنیائے فانی کے حقیر خزف ریزوں کو جمع کرنے میں برباد نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۶ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۹ - جمادی الاول ۱۴۰۰ھ